کے لیے دنیا میں نازل ہوا ہے۔ اسی کے باعث آج میں زہر کا گھونٹ پی رہی ہوں۔ رانی جانہوی جیسی نیک دل عورت کا مجھ سے برگشتہ ہو جانے کا کیا سبب تھا۔ میں اس فرشتہ خصلت انسان سے کیوں بے وفائی کرتی جس کی پرستش آج بھی دل میں کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی؟ اگر یہ سبب نہ ہوتا کہ مجھے اپنی روح کو یہ بے رحمانہ سزا دینی ہی کیوں پڑتی۔ میں اس معاملہ میں جتنا ہی غور کرتی ہوں، اتنی ہی مذہب کے متعلق بے اعتباری زیادہ ہوتی ہے۔ آہ۔ میرے بے وفائی سے ونے کو کتنا رنج ہوا ہوگا۔ اس کے خیال سے میری جان سوکھ جاتی ہے۔ وہ دیکھو مسٹر کلارک بلا رہے ہیں۔ شاید سرمن (وعظ) شروع ہونے والا ہے۔ جانا ہی پڑے گا ورنہ ماما جیتا نہ چھوڑیں گی۔''

پربھو سیوک تو قدم بڑھاتے ہوئے جا پہنچے۔ صوفیہ دو ہی چار قدم چلی تھی کہ یکا یک اسے سڑک پر کسی کے گانے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر چہار دیواری کے اوپر سے دیکھا کہ ایک اندھا آدمی ہاتھ میں کھنجری لیے یہ گیت گاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں
بیروں کا کام ہے مرنا
کچھ نام جگت میں کرنا
کیوں نج مرجادا چھوڑیں
کیوں جیت کی تجھ کو اچھا
کیوں ہار کی تجھ کر چنتا
کیوں دکھ سے ناتا جوڑیں
تو رنگ بھوم میں آیا
دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

صوفیہ نے اندھے کو پہچان لیا۔ سورداس تھا۔ وہ اس گیت کو کچھ اس طرح مست ہو کر گاتا تھا کہ سننے والوں کے دلوں پر چوٹ سی لگتی تھی۔ لوگ راہ چلتے سننے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ صوفیہ محو ہو کر یہ گیت سنتی رہی۔ اسے گیت کے تیسرے پد میں زندگی کا پورا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

تو رنگ بھوم میں آیا

دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں؟

راگ اتنا سریلا، اتنا شیریں، اتنا جوش افزا تھا کہ سماں بندھ گیا۔ راگ پر کھنجری کی تال اور بھی غضب کرتی تھی۔ جو سنتا تھا۔ سر دھنتا تھا۔

صوفیہ بھول گئی کہ میں گرجا جا رہی ہوں۔ سرمن کی ذرا بھی یاد نہ رہی۔ وہ بڑی دیر تک پھاٹک پر کھڑی اسی سرمن کو سنتی رہی۔ یہاں تک کہ سرمن ختم ہو گیا۔ معتقدین باہر نکل کر چلے۔ مسٹر کلارک نے آہستہ سے صوفیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

کلارک: لارڈ بشپ کا سرمن ختم ہو گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔

صوفیہ: اتنی جلد؟ ذرا میں اس اندھے کا گانا سننے لگی۔ سرمن کتنی دیر تک ہوا ہو گا؟

کلارک: نصف گھنٹہ سے کم نہ ہوا ہو گا۔ لارڈ بشپ کے سرمن مختصر ہوتے ہیں مگر نہایت دلکش۔ میں نے ایسا نورانی اور دانش مندانہ سرمن آج تک نہ سنا تھا۔ انگلستان میں بھی نہیں! افسوس کہ تم نہ آئیں۔

صوفیہ: مجھے تعجب ہوا ہے کہ میں یہاں نصف گھنٹہ تک کھڑی رہی۔

اسی اثناء میں مسٹر ایشورسیوک اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے۔

مسز سیوک نے کلارک کو مادرانہ محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ولیم۔صوفی آج کے سرمن کے بارے میں کیا کہتی ہے؟''

کلارک: یہ تو اندر گئی ہی نہیں۔

مسز سیوک نے صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''صوفیہ یہ تمہارے لیے شرم کی بات ہے!''

صوفیہ شرمندہ ہو کر بولی۔ ''مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں اس اندھے کا گانا سننے کے لیے ذرا رک گئی۔ اتنے میں سرمن ختم ہو گیا۔''

ایشور سیوک: بیٹی۔آج کا سرمن آب حیات کی طرح تھا جس نے روح کو آسودہ کر دیا۔جس نے نہیں سنا وہ تمام عمر پچھتائے گا۔پربھو مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ ایسا سرمن آج تک نہ سنا تھا۔

مسز سیوک: تعجب ہے کہ اس روحانی نغمہ کے سامنے تمہیں یہ دہقانی گیت زیادہ دلکش معلوم ہوا۔

پربھو سیوک: ماما یہ نہ کہیے۔دہقانی نغموں میں اکثر ایسی تاثیر ہوتی ہے جو مستند شعراء کے کلاموں میں بھی نہیں ہوتی۔

مسز سیوک: ارے یہ تو وہی اندھا ہے جس کی زمین ہم نے لی ہے۔آج یہاں کیسے آ پہنچا؟ ابھاگے نے روپے نہ لیے۔اب گلی گلی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

دفعتاً سورداس نے بلند آواز میں کہا۔ ''دہائی ہے! پنچو۔دہائی ہے! سیوک صاحب و راجہ صاحب نے میری جمین زبردستی چھین لی ہے۔مجھ دکھیا کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔دہائی ہے!

دربل کو نہ ستائیے جاکی موئی ہائے
موئی کھال کی سانس سوں سار بھسم ہوئے جائے

کلارک نے مسٹر سیوک سے پوچھا۔ ''اس کی زمین تو معاوضہ دے کر لی گئی تھی نا؟

اب یہ کیسا جھگڑا ہے؟''

مسز سیوک: اس نے معاوض نہیں لیا۔ روپے خزانہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ بدمعاش آدمی ہے۔

ایک عیسائی بیرسٹر صاحب نے جو چیئرمینی کے لیے راجہ صاحب چتاری کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے، سورداس سے پوچھا۔ ''کیوں اندھے کیسی زمین تھی؟ راجہ صاحب نے کیسے لے لی؟''

سورداس: ہجور۔ میرے باپ دادوں کی جمین (زمین) ہے۔ سیوک صاحب وہاں چرٹ بنانے کا کارخانا کھول رہے ہیں۔ ان کے کہنے سے راجہ صاحب نے وہ جمین مجھ سے چھین لی ہے۔ دہائی ہے سرکار کی۔ دہائی پنچو۔ گریب کی کوئی نہیں سنتا۔

عیسائی بیرسٹر نے کلارک سے کہا۔ ''میرے خیال میں خانگی فائدہ کے لیے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا خلاف قانون ہے۔''

کلارک: بہت معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔

بیرسٹر: آپ کسی کو معاوضہ لینے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ یہ ثابت نہ کر دیں کہ آپ زمین کو عوام کے فائدے کے لیے لے رہے ہیں۔

''کاشی آئرن ورکس'' کے مالک مسٹر جان برڈ نے جو جان سیوک کے پرانے مخالف تھے کہا۔ ''بیرسٹر صاحب! کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ سگریٹ کا کارخانہ کھولنا کارثواب ہے۔ سگریٹ پینے والے آدمی کو بہشت میں داخل ہونے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔''

پروفیسر چارلس سیمین جنہوں نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک پمفلٹ لکھا تھا، بولے۔ ''اگر سگریٹ کے کارخانہ کے لیے سرکار زمین دلا سکتی ہے تو کوئی سبب نہیں کہ چکلوں کے لیے نہ دلائے۔ سگریٹ کے کارخانہ کے لیے زمین پر قبضہ کرنا، اس قانونی دفعہ کا بیجا طور پر استعمال کرنا ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ میں دنیا کے بڑے

بڑے علماء اور حکماء کی رائیں درج کی تھیں۔ خرابی صحت کا خاص سبب سگریٹ نوشی کی کثرت ہے۔ افسوس کہ اس پمفلٹ کی عوام نے قدر نہ کی۔''

''کاشی ریلوے یونین'' کے سیکرٹری مسٹر نیل منی نے کہا۔ ''یہ سارے قاعدے سرمایہ داروں کی نفع رسانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور سرمایہ داروں ہی کو یہ تجویز کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ ان قواعد کا استعمال کب اور کہاں ہو۔ کتے کو کھال کی پاسبانی سپرد کی گئی ہے۔ کیوں اندھے تیری کل زمین کتنی ہے؟''

سورداس: بجور دس بیگھے سے کچھ جیادہ (زیادہ) ہوگی۔ سرکار باپ دادوں کی یہی نشانی ہے۔ پہلے راجہ صاحب مجھ سے مول مانگتے تھے۔ جب میں نے نہ دیا تو جبرجستی (زبردستی) چھین لی۔ بجور۔ اندھا اپاہج ہوں۔ آپ کے سوائے کس سے پھریاد (فریاد) کروں۔ کوئی سنے گا تو سنے گا نہیں بھگوان تو سنیں گے۔

جان سیوک اب یہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ باتوں باتوں میں جھگڑا ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اتفاق سے ان کے سبھی مخالفین یکجا ہو گئے تھے۔ مسٹر کلارک بھی صوفیہ کے ساتھ اپنی موٹر پر آ بیٹھے۔ راستہ میں جان سیوک نے کہا۔ ''کہیں راجہ صاحب نے اس اندھے کی فریاد سن لی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔''

مسز سیوک: پاجی آدمی ہے۔ اسے پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کرا دیتے۔

ایشور سیوک: نہیں بیٹا۔ ایسا بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ اخبار والے اس بات کا بتنگڑ بنا کر تمہیں بدنام کر دیں گے۔ یسوع! میرا منہ اپنے دامن میں چھپا اور اس نابکار کی زبان بند کر دے!

مسز سیوک: دو چار روز میں آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ ٹھیکہ داروں نے ٹھیکہ کر لیا نا؟

جان سیوک: ہاں۔ کام تو آج کل میں شروع ہو جانے والا ہے مگر اس موذی کو چپ کرانا سہل نہیں ہے۔ محلّہ والوں کو تو میں نے توڑ لیا۔ وہ سب اس کی مدد نہ کریں

گے۔مگر مجھے امید تھی کہ اس طرف سے مدد نہ پا کر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔یہ امید پوری نہ ہوئی۔معلوم ہوتا ہے بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔راجہ صاحب کا میونسپل بورڈ میں اب وہ زور نہیں رہا ورنہ کوئی اندیشہ نہ تھا۔انہیں پورے سال بھر تک ممبران بورڈ کی خوشامد کرنی پڑی۔تب جا کر یہ تجویز منظور کرا سکے۔ایسا نہ ہو کہ ممبر لوگ پھر کوئی چال چلیں۔

اتنے میں راجہ مہیندر کمار کی موٹر سامنے آ کر رکی۔راجہ صاحب بولے۔''آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔میں آپ کے بنگلہ سے واپس آ رہا ہوں۔آیئے ہم اور آپ سیر کر آئیں۔مجھے آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے۔''

جب جان سیوک موٹر پر بیٹھ گئے تو باتیں ہونے لگیں۔راجہ صاحب نے کہا۔''آپ کا سورداس تو ایک ہی بدمعاش نکلا۔کل سے سارے شہر میں گھوم گھوم کر گاتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے۔اندھے گانے میں اچھے ہوتے ہی ہیں۔اس کا راگ بہت لوچدار ہے۔بات کی بات میں اسے ہزاروں آدمی گھیر لیتے ہیں۔جب خوب مجمع ہو جاتا ہے تو وہ دہائی دیتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے۔''

جان سیوک: ابھی گرجا میں آ پہنچا تھا۔بس ہی دہائیاں دیتا تھا۔پروفیسر یمین مسٹر نیل منی وغیرہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔یہ لوگ اس کو اور بھی اکسا رہے ہیں۔شاید ابھی وہیں کھڑا ہو۔

راجہ صاحب: مسٹر کلارک سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی؟

جان سیوک: موجود تو وہ بھی تھے۔ان کی رائے ہے کہ اندھے کو پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔میں منع نہ کرتا تو وہ اسی وقت تھانہ دار کو لکھتے۔

راجہ صاحب: آپ نے بہت اچھا کیا کہ منع کر دیا۔اسے پاگل خانہ یا جیل خانہ بھیج دینا آسان ہے،لیکن عوام کو یہ یقین دلانا مشکل ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی گئی۔مجھے تو اس کی دوہائیوں تہائیوں کی پروا نہیں؟ مگر آپ جانتے ہیں کہ

ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ اگر اس کا یہی رویہ رہا تو دس پانچ دن میں ہم سارے شہر میں نکو بن جائیں گے۔

جان سیوک: اقتدار اور بدنامی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی فکر نہ کیجیے۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میں نے محلّہ والوں کو قابو میں لانے کے لیے بڑے بڑے وعدے کر لیے۔ جب اندھے پر کسی کا کچھ اثر ہی نہ ہوا تو میرے سارے وعدے بیکار ہو گئے۔

راجہ صاحب: اجی آپ کی تو جیت ہی جیت ہے۔ ہر طرف سے گیا تو میں۔ اتنی زمین آپ کو دس ہزار سے کم میں نہ ملتی۔ دھرم سالا بنوانے میں آپ کے اسی قدر روپے لگیں گے۔ مٹی تو میری خراب ہوئی۔ شاید زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں عوام کی نگاہوں سے گرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ چلیے ذرا پانڈے پور تک تو چلیں۔ ممکن ہے محلّہ والوں کے سمجھانے کا اب بھی کچھ اثر ہو۔

موٹر پانڈے پور کی طرف چلی۔ سڑک خراب تھی۔ راجہ صاحب نے انجینیر کو تاکید کر دی تھی کہ سڑک کی مرمت کا بندوبست کر دیا جائے مگر ابھی تک کہیں کنکر بھی نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا کہ جواب طلب کیا جائے۔ چنگی گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کا منشی آرام سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور سڑک پر کئی گاڑیاں رونے کے لیے کھڑی ہیں۔ منشی جی نے دل میں یہ تجویز کر لیا ہے کہ نئی گاڑی ایک روپیہ لیے بغیر روّنہ نہ ہونے دوں گا، ورنہ انہیں رات بھر یہیں کھڑا رکھوں گا۔ راجہ صاحب نے وہاں جاتے ہی گاڑی والوں کو روّنہ دلا دیا اور منشی کے رجسٹر میں یہ بات نوٹ کر دی۔ پانڈے پور پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ موٹر روکی۔ دونوں صاحب اتر کر مندر میں گئے۔ نایک رام لنگی چڑھائے بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ دوڑے ہوئے آئے۔ بجرنگی ناند میں پانی بھر رہا تھا۔ آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام بندگی کے بعد جان سیوک نے نایک رام سے کہا۔ ''اندھا تو بہت بگڑا ہوا ہے۔''

نائیک رام: سرکار بگڑا تو اتنا ہے کہ جس دن سے ڈونڈی پٹی اس دن سے گھر نہیں آیا۔ سارا دن شہر میں گھومتا ہے۔ بھجن گاتا ہے اور دوہائی دیتا ہے۔

راجہ صاحب: تم لوگوں نے اسے کچھ سمجھایا نہیں؟

نائیک رام: غریب پرور! اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ دوسرا آدمی ہو تو مار پیٹ کی دھمکی سے سیدھا ہو جائے مگر اسے تو ڈر جیسے چھو کر نہیں گیا۔ اسی دن سے گھر نہیں آیا۔

راجہ صاحب: تم لوگ اسے سمجھا بجھا کر یہاں لاؤ۔ ساری دنیا چھان ڈالی اور ایک جاہل کو قابو میں نہیں لا سکتے؟

نائیک رام: سرکار سمجھانا بجھانا تو میں نہیں جانتا۔ حکم ہو تو ہاتھ پیر توڑ کر بٹھا دوں۔ آپ ہی چپ ہو جائے گا۔

راجہ صاحب: چھی چھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں دیکھتا ہوں یہاں پانی کا نل نہیں ہے۔ تم لوگوں کو تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔

مسٹر سیوک: آپ یہاں نل پہنچانے کا ٹھیکہ لے لیجیے۔

نائیک رام: بڑی دیا ہے غریب پرور، نل آ جائے تو کیا کہنا۔

راجہ صاحب: تم لوگوں نے کبھی اس کے لیے درخواست ہی نہیں دی۔

نائیک رام: سرکار یہ بستی حد سے باہر ہے۔

راجہ صاحب: کوئی ہرج نہیں نل لگا دیا جائے گا۔

اتنے میں ٹھاکر دین نے آ کر کہا۔ ''سرکار میری بھی کچھ خاطر ہو جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے دونوں صاحبوں کی خدمت میں پیش کیے۔ مسٹر سیوک کو انگریزی وضع رکھنے پر بھی پان سے نفرت نہ تھی۔ شوق سے کھا لیا۔

راجہ صاحب نے منہ میں پان رکھتے ہوئے بولے۔ ''کیا یہاں لالٹینیں نہیں

ہیں؟ اندھیرے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔''

ٹھاکر دین نے نائیک رام کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا کہ میرے بیڑے نے رنگ جما دیا۔ بولا۔ ''سرکار۔ ہم لوگوں کی کون سنتا ہے۔ اب ہجور کی نگاہ ہوگئی ہے تو لگ ہی جائے گی۔ بس اور کہیں نہیں۔ اسی مندر پر ایک لالٹین لگا دی جائے۔ سادھو مہاتما آتے ہیں تو اندھیرے میں انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ لالٹین سے مندر کی سوبھا بڑھ جائے گی۔ سب کو آسیر باد دیں گے۔''

دونوں آدمی موڑ پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ سوبھاگی ایک سرخ ساڑھی پہنے گھونگٹ نکالے آکر ذرا فاصلہ پر کھڑی ہوگئی۔ گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

نائیک رام: سرکار! ایک پاسن ہے۔ کیا ہے سوبھاگی؟ کچھ کہنے آئی ہے؟

سوبھاگی: (آہستہ سے) کوئی سنے گا؟

راجہ صاحب: ہاں ہاں کہہ کیا کہتی ہے؟

سوبھاگی: کچھ نہیں مالک۔ یہی کہنے آئی تھی کہ سورداس کے ساتھ برا انیائے (بے انصافی) ہوا ہے۔ اگر ان کی پھریاد (فریاد) نہ سنی گئی تو وہ مرجائیں گے۔

جان سیوک: ان کے مرجانے کے ڈر سے سرکار اپنا کام چھوڑ دے؟

سوبھاگی: ہجور! سرکار کا کام پرجا کا پالنا ہے کہ اجاڑنا؟ جب سے یہ دھرتی نکل گئی ہے، اسے نہ کھانے کی سدھ ہے نہ پینے کی۔ ہم گریب عورتوں کا تو وہی ایک سہارا ہے۔ نہیں تو محلّہ کے مرد کبھی عورتوں کو جیتا نہ چھوڑتے اور مردوں کی تو ملی بھگت ہے۔ مرد چاہے عورت کے انگ انگ، پور پور کاٹ ڈالے۔ اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔ چور چور موسیرے بھائی ہو جاتے ہیں۔ وہی ایک بیچارہ سورداس تھا جو ہم گریبوں کی پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

بھیرو بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بولا۔ ''ہجور! سورداس نہ ہوتا تو یہ سرکار کے سامنے

کھڑی نہ ہوتی۔اس نے جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔''

راجہ صاحب: آدمی جیوٹ کا معلوم ہوتا ہے۔

نائیک رام: جیوٹ کیا ہے سرکار، بس یہ سمجھئے کہ ہتیا کے بل جیتنا ہے۔

راجہ صاحب: بس یہ بات تم نے بہت ٹھیک کہی۔ ہتیا ہی کے بل جیتنا ہے۔ چاہوں تو آج پکڑوا دوں مگر سوچتا ہوں اندھا ہے۔اس پر کیا غصہ دکھاؤں۔تم لوگ اس کے پڑوسی ہو۔تمہاری بات کچھ نہ کچھ سنے گا ہی۔تم لوگ اسے سمجھاؤ۔نائیک رام! ہم تم سے تاکید کر کے کہے جاتے ہیں۔

ایک گھنٹہ رات جا چکی تھی۔ کہرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ دکانوں کے چراغوں کے چاروں طرف کوئی موٹا کاغذ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں اصحاب رخصت ہوئے مگر دونوں ہی فکر میں محو تھے۔ راجہ صاحب سوچ رہے تھے کہ دیکھیں لالٹین اور نل کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ جان سیوک کو فکر تھی کہ کہیں مجھے جیتی ہوئی بازی نہ کھونی پڑے۔

(19)

صوفیہ اپنے تفکرات میں اس قدر محو تھی کہ سورداس کو بالکل بھول سی گئی تھی۔اس کی فریاد سن کر اس کا دل کانپ اٹھا۔اس غریب آدمی پر اتنا زبردست ظلم۔اس کا دردمند دل اسے برداشت نہ کر سکا۔سوچنے لگی۔سورداس کو اس مصیبت سے کیونکر نجات دلاؤں؟ اگر پاپا سے کہوں تو وہ ہرگز نہ سنیں گے۔انہیں اپنے کارخانہ کی ایسی دھن سوار ہے کہ وہ اس بارے میں میری زبان سے ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کریں گے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ چل کر اندو سے عرض کروں۔اگر وہ راجہ صاحب سے زور دے کر کہے گی تو ممکن ہے کہ راجہ صاحب مان جائیں۔باپ سے مخالفت کرتے اسے بہت افسوس ہوتا تھا،لیکن اس کی مذہبی نگاہ میں رحم کی عظمت اس قدر مسلمہ تھی جس کے مقابلہ میں باپ کے نفع یا نقصان کی کوئی وقعت نہ تھی۔وہ

جانتی تھی کہ راجہ صاحب غریب نواز ہیں اور انہوں نے سورداس پر صرف مسٹر کلارک کی خاطر سے یہ ظلم کیا ہے۔ جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں اس کام کے لیے ان کی ذرا بھی ممنون نہ ہوں گی تو شاید وہ اپنے فیصلہ کی نظر ثانی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہاں جوں ہی بات کھلے گی، سارا گھر میرا دشمن ہو جائے گا مگر اس کی کیا پروا۔ اس خیال سے میں اپنا فرض تو نہیں ترک کر سکتی۔

اسی حیص بیص میں تین روز گزر گئے تھے۔ روز علی الصبح وہ اندو سے ملنے کو چلی۔ سواری کرایہ کی تھی۔ وہ سوچتی جاتی تھی کہ میں جوں ہی قدم اندر رکھوں گی، اندو دوڑ کر گلے لپٹ جائے گی اور شکایت کرے گی کہ اتنے دنوں بعد کیوں آئیں؟ ممکن ہے وہ آج مجھے آنے بھی نہ دے۔ وہ راجہ صاحب کو ضرور رضامند کر لے گی۔ نہ جانے پاپا نے راجہ صاحب کو کیونکر چکمہ دیا۔

یہی سوچتے سوچتے وہ راجہ صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ اندو کو خبر دی۔ اس کو یقین تھا کہ اندو خود آ کر اسے لے جائے گی، لیکن پندرہ منٹ تک انتظار کرنے پر ایک خادمہ آئی اور اسے اندر لے گئی۔

صوفیہ نے جا کر دیکھا کہ اندو اپنی نشست گاہ میں دوشالہ اوڑھے انگیٹھی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ صوفیہ نے اندر قدم رکھا تو بھی اندو کرسی سے نہ اٹھی۔ صوفیہ نے ہاتھ بڑھایا تو بھی بے رخی سے ہاتھ بڑھا دینے کے سوا اندو منہ سے کچھ نہ بولی۔ صوفیہ نے سمجھا اس کی طبیعت ناساز ہے۔ بولی ''سر میں درد ہے کیا؟''

اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بیماری کے سوا اس بے اعتنائی کا اور بھی کوئی سبب ہو سکتا ہے۔

اندو نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''نہیں اچھی تو ہوں۔ اس ٹھنڈ میں تو تمہیں بڑی تکلیف ہوئی؟''

صوفیہ خوددار عورت تھی۔ اندو کی اس بے اعتنائی سے اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔

پہلے تو یہ خیال ہوا کہ الٹے قدم واپس جاؤں مگر یہ سوچ کر کہ ایسا کرنا بہت مضحکہ خیز ہو گا۔ اس نے ہمت کر کے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ: آپ سے ملے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔

اندو: ہاں مجھے آنے جانے کی فرصت کم رہتی ہے۔ منڈیا ہوں کی رانی صاحبہ ایک مہینہ میں تین مرتبہ آ چکی ہیں۔ پر میں ایک دفعہ بھی نہیں جا سکی۔

صوفیہ دل میں ہنستی ہوئی طنز سے بولی۔ ''جب رانیوں کو یہ بات نہیں حاصل ہوتی تو میں کس شمار میں ہوں۔ کیا کچھ ریاست کا کام بھی دیکھنا پڑتا ہے؟''

اندو: کچھ نہیں بلکہ سب کچھ۔ راجہ صاحب کو قومی کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تو گھر کا کام دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہیے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ جب انہی کاموں کے بدولت ان کی وہ عزت ہے جو بڑے سے بڑے حکام کو بھی نہیں ملتی تو ان سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتی۔

صوفیہ ہنوز نہ سمجھ سکی کہ اندو کی ناراضگی کا سبب کیا ہے۔ بولی۔ ''آپ بڑی خوش نصیب ہیں کہ اس طرح ان کے نیک کاموں میں شریک ہو سکتی ہو۔ راجہ صاحب آج سارے میں نیک نام ہو رہے ہیں۔ مگر برا نہ مانیے گا کبھی کبھی وہ بھی منہ دیکھی کر جاتے ہیں اور بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا خیال نہیں کرتے۔''

اندو: غالباً یہ ان کی پہلی شکایت ہے جو میرے کان تک پہنچی ہے۔

صوفیہ: ہاں بدقسمتی سے یہ کام میرے ہی سر پڑا۔ سور داس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ راجہ صاحب نے اس کی زمین پاپا کو دے دی ہے۔ اندھا بے چارہ آج کل کوچہ کوچہ دوہائی دیتا پھرتا ہے۔ باپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا میرے لیے باعث شرم ہے۔ یہ میں خوب سمجھتی ہوں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس موقع پر راجہ صاحب کو ایک بیکس شخص پر زیادہ رحم کرنا چاہیے تھا۔

اندو نے صوفیہ کی طرف متنفرانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''آج کل باپ سے بھی

ان بن ہے کیا؟''

صوفیہ نے غرور سے کہا۔ ''انصاف اور فرض کے سامنے باپ، لڑکا یا شوہر کی جانبداری نہ کی جائے تو کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔''

اندو: تو تمہیں پہلے اپنے آپ ہی کو ٹھیک راستہ پر لانا چاہیے تھا۔ راجہ صاحب نے جو کچھ کیا تمہاری خاطر سے کیا اور تمہی ان پر الزام رکھتی ہو۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ انہیں مسٹر سیوک، مسٹر کلارک یا دنیا کے کسی اور شخص سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس وقت انہوں نے تمہارے پاپا کا خیال نہ کیا ہوتا تو شاید سب سے پہلے تمہی ان پر احسان فراموشی کا الزام عاید کرتیں۔ سورداس پر یہ ستم اس لیے ڈھایا گیا کہ تم نے ایک نازک موقع پر ونے کی حفاظت کی ہے۔ اور تم اپنے پاپا کی بیٹی ہو۔

صوفیہ یہ سخت الفاظ سن کر تلملا گئی۔ بولی۔ ''اگر میں جانتی کہ میری ناچیز خدمت کا صلہ اس طرح دیا جائے گا تو شاید وِنے سنگھ کے نزدیک نہ جاتی۔ معاف کیجیے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ تمہارے پاس یہ شکایت لے کر آئی۔ سنا کرتی تھی کہ امراء کے مزاج میں تلون ہوتا ہے۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔ لیجیے جاتی ہوں مگر اتنا کہے جاتی ہوں کہ خواہ پاپا میری صورت سے بھی بیزار ہو جائیں لیکن میں اس معاملہ میں ہرگز خاموش نہ بیٹھوں گی۔''

اندو: کچھ نرم ہو کر بولی۔ ''آخر تم راجہ صاحب سے کیا چاہتی ہو؟''

صوفیہ: کیا ثروت سے عقل بھی کم ہو جاتی ہے۔

اندو: میں پیادہ سے وزیر نہیں بنی ہوں۔

صوفیہ: افسوس کہ آپ نے اب تک میرا مطلب نہ سمجھا۔

اندو: افسوس کرنے سے تو مطلب میری سمجھ میں نہ آئے گا۔

صوفیہ: میں چاہتی ہوں کہ سورداس کی زمین اس کو لوٹا دی جائے۔

اندو: تم جانتی ہو۔ اس میں راجہ صاحب کی کتنی سبکی ہوگی۔

صوفیہ: سکی بے انصافی سے بہتر ہے۔

اندو: یہ بھی جانتی ہو کہ جو کچھ ہوا وہ تمہارے..... مسٹر کلارک کی ترغیب سے ہوا؟

صوفیہ: یہ تو نہیں جانتی کیونکہ اس بارے میں میری ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی، لیکن جانتی بھی تو راجہ صاحب کی بدنامی کے خیال سے پہلے راجہ صاحب ہی سے منت سماجت کرنا ٹھیک سمجھتی۔ اپنی غلطی اپنے ہی ہاتھوں درست ہو جائے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی دوسرا اسے درست کرے۔

اندو کو چوٹ لگی۔ سمجھی کہ یہ مجھے دھمکی دے رہی ہے۔ مسٹر کلارک کے بل پر اتنا گھمنڈ! تن کر بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ کسی سرکاری افسر کو بورڈ کے فیصلہ میں بھی دخل دینے کا مجاز ہے اور چاہے ایک غریب اندھے پر ظلم کیوں نہ کرنا پڑے۔ راجہ صاحب اپنے فیصلہ کو بحال رکھنے کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ حقیر انصاف کے مقابلہ میں راجہ کی عزت کہیں زیادہ وقعت کی چیز ہے۔''

صوفیہ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ ''اسی حقیر انصاف کے لیے صدق پسند لوگوں نے سر کٹا دیئے ہیں۔''

اندو نے کرسی کے بازو پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ ''انصاف کا سوانگ بھرنے کا زمانہ اب نہیں رہا۔''

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمائیے گا۔''

اندو انگیٹھی کی آگ کو اکسانے لگی۔ اس نے صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

صوفیہ وہاں سے چلی تو اندو کی کج خلقی سے اس کا نازک دل زخمی ہو رہا تھا۔ سوچتی جاتی تھی کہ وہ شگفتہ رو، خلیق اور خوش مزاج اندو کہاں ہے؟ کیا دولت و ثروت سے انسان کا مزاج بھی اتنا بگڑ جاتا ہے؟ میں نے تو آج تک اس کا دل دکھانے والی

بات نہیں کہی۔ کیا میں ہی کچھ اور ہو گئی ہوں یا وہی کچھ اور ہو گئی ہے؟ اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ بات کرنا تو دور، اس نے اور صلواتیں سنائیں۔ میں اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ دیوی ہے۔ آج اس کی اصلی صورت نظر آئی، لیکن میں اس کی ثروت کے سامنے کیوں سر جھکاؤں۔ اس نے بلا سبب اور بلاواسطہ میری تحقیر کی۔ شاید رانی صاحب نے اس کے کان بھرے ہوں، لیکن شرافت بھی تو کوئی چیز ہے۔

صوفیہ نے اسی وقت اس توہین کا پورا بلکہ پورے سے بھی زیادہ بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے یہ خیال نہ کیا کہ ممکن ہے اس وقت کسی سبب سے اس کا دل مغموم رہا ہو یا کسی حادثہ کے باعث اس کے سکون میں فرق آ گیا ہو۔ اس نے سوچا۔ ایسی ناشائستگی، ایسی بدسلوکی کے لیے سخت سے سخت دماغی تکلیف، بڑے سے بڑے مالی نقصان، شدید سے شدید جسمانی درد کا عذر بھی کافی نہیں۔ اسے اپنی امارت کا غرور ہے۔ میں دکھا دوں گی کہ یہ آفتاب کی ذاتی روشنی نہیں بلکہ ماہتاب کی عارضی ضیا ہے۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ راجہ اور رئیس سب کے سب حکمران قوت کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں جنہیں وہ اپنی مرضی کے موافق بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے۔

دوسرے ہی روز صوفیہ نے اپنی چال چلنا شروع کر دی۔ مسٹر کلارک سے اس کی محبت بڑھنے لگی۔ نفرت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی۔ اب ان کی محبت بھری باتوں کو سر جھکا کر سنتی۔ ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتی کہ تم نے یہ محبت کرنا کس سے سیکھا؟ دونوں اب ہمیشہ ساتھ نظر آتے۔ صوفیہ دفتر میں بھی صاحب بہادر کا گلا نہ چھوڑتی بار بار خط بھیجتی۔ ''جلد آؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔'' اور سارا عشق و محبت کا کھیل صرف اس لیے تھا کہ اندو سے ہتک کا انتقام لے سکوں۔ انصاف کوشی کا اب اس کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ صرف اندو کو گھمنڈ توڑنا چاہتی تھی۔

ایک روز مسٹر کلارک کو پانڈے پور کی طرف سیر کرانے لے گئی۔ جب موٹر گودام

کے سامنے سے ہو کر گزری تو اس نے اینٹ اور کنکر ڈھیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''پاپا نہایت عجلت سے کام کر رہے ہیں۔''

کلارک: ہاں مستعد آدمی ہیں۔ مجھے تو ان کی محنت و جفاکشی پر رشک ہوتا ہے۔

صوفی: پاپا نے دھرم، ادھرم کا خیال نہیں کیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گی کہ اندھے کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔

کلارک: ہاں بے انصافی تو ہوئی۔ میرا جی تو بالکل نہ چاہتا تھا۔

صوفی: تو آپ نے کیوں اپنی منظوری دے دی۔

کلارک: کیا کرتا؟

صوفی: نامنظور کر دیتے۔ صاف لکھ دینا چاہیے کہ اس کام کے لیے کسی کی زمین ضبط نہیں کی جا سکتی۔

کلارک: تم ناراض ہو جاتیں؟

صوفی: ہرگز نہیں۔ آپ، آپ نے شاید مجھے اب تک نہیں پہچانا۔

کلارک: تمہارے پاپا تو ضرور ہی ناراض ہو جاتے۔

صوفی: میں اور پاپا ایک نہیں ہیں۔ میرے اور ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کلارک: اتنی عقل ہوتی تو اب تک تمہیں کب کا اپنا ہی بنا لیا ہوتا۔ میں تمہارے مزاج یا اصولوں سے واقف نہ تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ منظوری میرے لیے نفع بخش ہو۔

صوفی: تو خلاصہ یہ کہ میں ہی اس ناانصافی کا سبب ہوں۔ راجہ صاحب نے مجھے خوش کرنے کے لیے بورڈ میں یہ تجویز پیش کی۔ آپ نے بھی مجھی کو خوش رکھنے کے لیے یہ منظوری دے دی۔ آپ صاحبوں نے میری مٹی ہی پلید کر دی۔

کلارک: تم میرے اصولوں سے واقف ہو۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کر کے یہ

تجویز منظور کی ہے۔۔

صوفی: اپ نے اپنے اوپر جبر نہیں کیا ہے بلکہ میرے اوپر کیا ہے اور آپ کو اس کا کنارہ کرنا ہوگا۔

کلارک: میں نہ جانتا تھا کہ تم اتنی انصاف پسند ہو۔

صوفی: میری تعریف کر دینے سے اس گناہ کا کنارہ نہ ہوگا۔

کلارک: میں اندھے کو کسی دوسرے گاؤں میں اتنی ہی زمین دلا دوں گا۔

صوفی: کیا اسی کی زمین اسی کو واپس نہیں دی جا سکتی۔

کلارک: مشکل ہے۔

صوفیہ: ناممکن تو نہیں ہے۔

کلارک: ناممکن سے کچھ ہی کم ہے۔۔

صوفی: تو سمجھ گئی۔ ناممکن نہیں ہے۔ آپ کو یہ کنارہ کرنا ہی ہوگا۔ کل ہی اس تجویز کو منسوخ کر دیجیے۔

کلارک: پیاری تمہیں معلوم نہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔

صوفیہ: مجھے اس کی فکر نہیں۔ پاپا کو برا لگے گا، لگے۔ راجہ صاحب کی سبکی ہوگی، ہو۔ میں کسی کے نفع یا عزت کے خیال سے اپنے اوپر گنہ کا بوجھ کیوں لوں؟ کیوں خدائی سزا کی مستوجب بنوں؟ آپ لوگوں نے میری مرضی کے خلاف میرے سر پر ایک گناہ عظیم کا بار رکھ دیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو اندھے کی زمین لوٹا دینی ہوگی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سید طاہر علی نے صوفیہ کو موٹر پر بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ فوراً آ کر سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ صوفی نے موٹر روک کر پوچھا۔

''کہیے منشی جی۔ عمارت بننے لگی؟''

طاہر: جی ہاں۔ کل داغ بیل پڑے گی، پر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں

آتی۔

صوفیہ: کیوں۔کیا کوئی واردات ہوگئی؟

طاہر: حضور جب سے اس اندھے نے شہر میں آہ وفریاد شروع کی ہے، اس وقت سے عجیب مصیبت کا سامنا ہوگیا۔محلّہ والے تو اب نہیں بولتے مگر شہر کے شہدے لچے روزانہ آ کر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔کوئی گھر میں آگ لگانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مجھے لوٹ لینے کو دوڑتا ہے اور کوئی مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔آج صبح کئی سو آدمی لاٹھیاں لیے آ گئے اور گودام کو گھیر لیا۔ کچھ لوگ سیمنٹ اور چونہ کے ڈھیروں کو بکھیرنے لگے اور کئی آدمی پتھر کی سلوں کو توڑنے لگے۔ میں تنہا کیا کر سکتا تھا۔ یہاں کے مزدور خوف کے مارے جان لے کر بھاگے۔قیامت کا سامنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔اب آن کی آن میں محشر برپا ہو جائے گا۔ دروازہ بند کئے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ ہنگامہ فرو ہو۔ بارے دعا قبول ہوئی۔عین اسی وقت وہ اندھا نہ جانے کدھر سے آ نکلا اور بجلی کی طرح کڑک کر بولا ''بھائیو! تم لوگ اودھم مچا کر مجھے کیوں کلنک لگا رہے ہو؟ آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی۔ لہو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا۔آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہوگی۔ پرماتما سے کہیے میرا دکھ مٹائیں۔بھگوان سے بنتی کیجیے میرا سنکٹ ہریں۔جنہوں نے مجھ پر جلم (ظلم) کیا ہے، ان لوگوں کے دل میں دیا دھرم جاگے۔بس میں آپ لوگوں سے اور کچھ نہیں چاہتا۔''

اتنا سنتے ہی کچھ لوگ تو ہٹ گئے مگر کتنے ہی لوگ بگڑ کر بولے۔''تم دیوتا ہو تو بنے رہو۔ہم دیوتا نہیں ہیں۔ہم تو جیسے کے ساتھ تیسا کریں گے۔انہیں بھی تو غریبوں پر ظلم کرنے کا مزہ مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ لوگ پتھروں کو اٹھا اٹھا کر پٹکنے لگے۔اس وقت اس اندھے نے وہ کام کیا جو اولیا ہی کر سکتے ہیں۔حضور مجھے تو یہ یقین کامل ہو گیا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔اس کی

تصویر ابھی تک آنکھوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ اس نے زمین سے ایک بڑا پتھر اٹھالیا اور اسے اپنی پیشانی کے سامنے رکھ کر بولا۔ ''اگر تم لوگ اب بھی میری بنتی نہ سنو گے، تو اسی دم اس پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا۔ مجھے مرجانا منظور ہے، پر یہ اندھیر نہیں دیکھ سکتا۔'' اس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہ وہیں بت بن گیا۔ ذرا دیر میں لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور کوئی نصف گھنٹہ میں سارا مجمع غائب ہوگیا۔ پھر سورداس اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر ہی چلا گیا۔ حضور مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ انسان نہیں۔ کوئی فرشتہ ہے۔''

صوفیہ: اس کو کسی سے ان مفسدوں کی یورش کی خبر مل گئی ہوگی۔

طاہر: حضور میرا تو قیاس ہے کہ اسے علم غیب ہے۔

صوفیہ: (مسکرا کر) آپ نے پاپا کو اس کی اطلاع نہیں دی؟

طاہر: حضور جب سے موقع ہی نہیں ملا۔ خود بال بچوں کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آدمی سب پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ اسی فکر میں کھڑا تھا کہ حضور کی موٹر نظر آئی۔

کلارک: یہ اندھا ضرور کوئی غیر معمولی انسان ہے۔

صوفیہ: تم اس سے دو چار باتیں کر کے دیکھو۔ اس کے روحانی اور فلسفیانہ خیالات معلوم کر کے دنگ رہ جاؤ گے۔ فقیر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ کاش ہم اس کے فلسفہ پر عمل کر سکتے تو یقیناً یہ زندگی آرام سے گزرتی۔ جاہل ہے۔ بالکل ان پڑھ، لیکن اس کا ایک ایک فقرہ علماء کی بڑی بڑی کتب سے زیادہ وزن دار ہے۔

موٹر چلی تو صوفیہ بولی: ''آپ لوگ ایسے سادھوؤں پر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے جو اپنے دشمنوں پر ایک کنکر بھی اٹھا کر نہیں پھینکتا۔ حضرت یسوع میں بھی تو یہی بہترین صفت تھی۔''

کلارک: پیاری۔ اب شرمندہ نہ کرو۔ اس کی تلافی ضرور ہوگی۔

صوفیہ: راجہ صاحب اس کی پرزور مخالفت کریں گے۔

کلارک: اوہ۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں، ہمارا رخ دیکھ کر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ ہاں ان میں یہ خاص صفت ہے کہ وہ ہماری تجاویز میں کچھ ترمیم کر کے اپنا کام بنا لیتے ہیں اور انہیں عوام کے سامنے ایسی ہوشیاری سے پیش کرتے ہیں کہ عوام کی نگاہوں میں ان کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی رئیسوں اور مدبروں میں اپنے پر بھروسہ رکھنے والی قوت کی بہت کمی ہے۔ وہ ہماری مدد سے وہ کر سکتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ مگر بلا ہماری مدد کے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

موٹر سگرا آ پہنچی۔ صوفیہ اتر پڑی۔ کلارک نے اسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

(20)

مسٹر کلارک نے موٹر سے اترتے ہی اردلی کو حکم دیا کہ ڈپٹی صاحب کو فوراً ہمارا سلام دو۔ ناظر، اہلمد اور اہلکاروں کو بھی طلب کیا گیا۔ سب کے سب گھبرا گئے۔ یہ آج خلاف معمول طلبی کیسی؟ کسی غلطی کی گرفت تو نہیں کی گئی؟ کسی نے رشوت کی شکایت تو نہیں کر دی؟ بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ڈپٹی صاحب برہم ہو کر بولے۔ ''میں کوئی صاحب کا ذاتی ملازم نہیں ہوں کہ جب چاہا طلب کر لیا۔ کچہری کے وقت کے اندر جتنی بار چاہیں طلب کریں، لیکن یہ کون سی بات ہے کہ جب جی میں آیا سلام بھیج دیا۔'' ارادہ کیا کہ نہ جاؤں پر اتنی ہمت کہاں کہ صاف صاف انکار کر دیں۔ بیماری کا حیلہ کرنا چاہا مگر اردلی نے کہا۔ ''حضور اس وقت نہ چلیں گے تو صاحب سخت ناراض ہوں گے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔ جبھی تو موٹر سے اترتے ہی آپ کو سلام دیا۔''

آخر ڈپٹی صاحب کو مجبوراً جانا پڑا۔ چھوٹے عملوں نے ذرا بھی چون و چرا نہ کیا۔